الٰہی بخش جار اللہ

عظمتِ قرآن کے چند بلاغی پہلو

عظمتِ قرآن کی کیا بات ! قرآن تو سراسر عظمت ہی عظمت ہے ۔ اس کے ان گنت زوایا ہیں اور ہر زاویہ لاتعداد عظمتوں کا آئینہ دار ہے ۔ جب سے وہ انسانیت کے دل و دماغ اور وجدان و شعور کے افق پر طلوع ہوا ہے ، اسی وقت سے دوست دشمن ، سب کی توجہات کا مرکز ، قلوب و انظار کا مطمح اور اذہان و شعور کا محور بنا ہوا ہے ۔ اس کی عجیب کیفیت ہے وہ ہر ایک دل پر جلوہ فگن اور ہر ایک دماغ پر ضوفشاں ہے ۔ اس کی حلاوتیں ہر وجدان میں گھر کرتی ہیں ، اور اس کی تنویرات کو ہر روح قریب تر پاتی ہے ، لیکن اس کے باوجود بھی انسانی فہم و فراست اس کی کنہ پانے سے عاجز و درماندہ ہے[1] ہر دور میں انسانی عقول اس کی تنویرات کی حقیقت تک رسائی پانے کے لیے تگ و دو کیا کیں اور اب بھی مصروف ہیں ، مگر انجام ایک ہے : اس کو ہر لمحہ اپنے سے قریب تر پا کر بھی ، اس کی انتہا کو پانے سے عاجزی ، انکساری ، درماندگی اور افتادگی ۔ بعینہ اسی طرح جیسے سورج کی کرنیں ، کہ ہر نظر ان کو قریب پاتی ہیں ، اور جب نظر کے قافلے ادھر سفر کرتے ہیں جدھر سے وہ جہاں آراء ہوتی ہے ، تو ہر دم انھیں قریب تر پا کر بھی ، ان کو رسائی سے دور ، بہت دور پاتے ہیں ۔ بالآخر تھک ہار کر واپس لوٹ آتے ہیں ۔

۱۔ قرآنی اعجاز کی دوہری نسبت ہے ۔ پہلی قرآن کی طرف : وہ معجز ہے ۔ دوسری مخلوقات کی جانب : وہ عاجز ہیں ۔ ان کا عاجز ہونا اس کے معجز ہونے کا لازمی نتیجہ ہے ۔

جبھی تو وہ کہتا ہے -

''اب تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے ، کہیں تجھ کو خلل نظر آتا ہے - پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ ، واپس لوٹ آئے گی تیری طرف نگاہ ، ذلیل اور در ماندہ ہو کر'' -

اس کی لامتناہی تنویرات میں سے اس وقت صرف ایک پر اپنی بساط کے مطابق کچھ عرض کرتا ہوں ، جس کو قرآن کے بلاغی یا لسانی حسن کا نام دیا جاتا ہے - کیونکہ اس کے موضوع و مقصد کی بلندی ، اس کے مضامین و مطالب کی پاکیزگی ، اس کی فصاحت و بلاغت کی دلکشی ، اس کے بیان کی حیرت انگیزی اور اس کے استدلال کی قوت - اس کے لف و نشر کی یکسانیت و نیرنگی ، اس کی تشبیہات کی طرفگی ، اس کے کنایات کی لطافت اور اس کے استعارات کی برجستگی - اس کی تمثیلات کی باریکی ، اس کے اجمال و تفصیل کا دلنشین انداز اور عقل و شعور پروارد ہونے والے اس کے پرکیف اور اعلٰی معانی کا ادراک ، اس کے بلاغی پہلو کو سمجھے بغیر حاصل کر لینا ناممکن ہے -

یہ پہلو اس لیے بھی اہم ہے کہ جب قرآن مجید کو انسانی ذہن کے افق پر طلوع ہونا تھا تو اس کے طلوع سے کچھ پہلے جزیرۃ العرب کے لوگوں کے اذہان میں بالخصوص اور تمام انسانیت کے اذہان میں بالعموم ، فطرت کے عام اصول کے مطابق ، ایک اچانک تبدیلی رونما ہوئی - بعینہ اسی طرح جیسے طلوعِ آفتاب سے قبل صبح کے کے نورانی خیوط ، اس کے آنے کی خبر دیتے ہیں ، اور برساتوں سے پہلے ٹھنڈی ہوائیں مژدۂ جانفرا سناتی ہیں - بالکل اسی طرح جیسے بچے سے پہلے ماں کے سینے میں مامتا موجزن ہوتی ہے - وہ تبدیلی یہ تھی : جب اللہ تعالٰی کو قرآن مجید نازل کرنا منظور ہوا تو عرب میں اچانک فصاحت و بلاغت کا ذوق پیدا کر دیا گیا : یا تو وہ اونٹ کی چپ و راست کی بے سلیقہ حکایت و نقالی کے سوا کچھ سلیقہ نہ رکھتے تھے اور ، یا پھر ، دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے مثال

شاعر اور قصیدہ گو نظر آنے لگے ۔ ابھی تو ان کی زبان ایک علاقائی زبان سے زیادہ کچھ نہ تھی ، اور پھر کیا تھا کہ ہر قسم کے مضامین کو ادا کرنے کے لیے بیحد وسیع دکھائی دینے لگی ، اور خیال آفرینی ، جدت طرازی اور نادر افکار کے اظہار کے لیے موزوں تر ٹھہری ۔ جگہ بجگہ شعراء کی ٹولیاں پیدا ہو گئیں ، شاعری اس قدر عام ہوئی کہ ہر کس و ناکس نے زبان کا ذوق پایا ، زبان کا حسن شخصی صلاحیت ہونے کے بجائے قومی شعور بن گیا ، ہر زبان سے بیان و تبیین کا ترشح ہونے لگا ۔ ہر کان فصاحت و بلاغت کا آشنا بن گیا ، عربیت و فصاحت ہم معنی سمجھے جانے لگے ۔ لسانی حسن ، سخن وری ، سخن شناسی ان کا وجدان ہو گیا ۔ وہ بیان کو جادو اور جادو کو حسنِ بیان سے تعبیر کرنے لگے ۔ انھوں نے بیان کی خوبی کا ایسا ملکہ پا لیا کہ عربی زبان سے ناآشنا ان کی نگہ میں نابلد ، اظہار ماضی فی الضمیر سے عاجز اور عجمی دکھائی دینے لگے ۔

عین اس وقت جب عرب میں لسانی حسن اور فصاحت و بلاغت کا سمندر موجزن تھا پیکرِ نور ، نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'نورِمبین' کی نورانی آیات تلاوت فرمائیں ۔

پھر کیا تھا ؟ منبعِ جوامع الکلم ، سرچشمۂ فصاحت و بلاغت ، نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جادو بیانوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں ، وہ اس کے سامنے دم بخود اور حیرت زدہ رہ گئے ، انھیں نہ اپنا ہوش رہا اور نہ اپنی شاعری کا :

صحن چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آ گیا تو ساری بہاروں پہ چھا گیا

بعینہ اسی طرح جیسے فرعونی جادوگروں کا 'سحرِعظیم' بےحقیقت ہو کر رہ گیا ، جب اس کا سامنا موسوی اعجاز سے ہوا ۔ یہ صرف تشبیہ ہی نہیں ، بلکہ سورۂ 'الشعراء' ابتداء سے اس واقعہ کے اختتام تک پڑھی جائے ، اور سورہ کی آخری چند آیات پر غور کیا جائے تو دونوں واقعات کا گہرا تعلق

واضح ہو جاتا ہے ۔

بعض لوگ ، بد قسمتی سے ، تنزیل ِ کلام ِ مجید اور عربی زبان و ادب کے ارتقاء کے باہمی تعلق کو نہیں سمجھ سکے ، یا انھوں نے اسے سمجھنا چاہا ہی نہیں ، اس لیے ان کی نگہ میں عربی شاعری کا اچانک اس قدر روشن طریق پر ابھر آنا ، اور پھر نزول ِ قرآن کے بعد کافی عرصہ تک تعطل میں رہنا ، عقدۂ لاینحل بن گیا ہے ۔ انھیں اس بات کا سراغ نہیں مل سکا کہ ایک بادیہ نشین ، بد و قوم لسانی ارتقائے مراحل طے کیے بغیر اس قدر فصیح اور بلیغ کیسے بن گئی ، اور ہر فن کی اعلیٰ اقدار سے شناسائی حاصل کر لینے کے بعد ، عین اس وقت جب اس کی قوتیں شباب پر تھیں ، وہ اچانک خموش کیسے ہو گئی ۔ لیکن یہ مسئلہ خود خود حل ہو جاتا ہے جب یہ بات ذہن نشین کر لیجائے کہ یہ سب تیاری اور جذبہ قرآن مجید کے بیانی حسن و عظمت کے انجذاب کے لیے تھا ، تا کہ قوم قرآنی جمالیات اور اس کے حسن کے تعدیل و تسویہ کو بھانپ سکے اور اس کا ادراک کرنے کے قابل ہو سکے : اسی مقصد کے لیے یہ صلاحیتیں بیدار کی گئی تھیں اور جب انھیں وہ مل گیا ، جس کے لیے وہ ابھری تھیں ، تو وہ دیگر تمام عواطف سے بیگانہ ہو کر اسی میں گم ہو گئیں ، جس کے لیے وہ ابھری تھیں ۔

تاہم قرآن مجید صرف عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا ۔ وہ تو عالمگیر ہے اور سارے جہان کے لیے ہے ۔ اس لیے ضروری ہوا کہ غیر عرب بھی اس کی فصاحت و بلاغت ، اس کے معانی کی نزاکت اور اس کے مطالب کی عمدگی سے مستفید ہوں ۔ اہل ِ عرب کے لیے قرآنی بیان کو سمجھنے کی خاطر جو صورت خالق ِ کون و مکان نے فرمائی وہ ان کے مناسب حال تھی ۔ چونکہ وہ اہل ِ زبان تھے ان کے لیے یہی موزون تھا کہ ان کے وجدان کو ترقی دی جاتی تا کہ قرآنی محاسن کو سمجھنے کا شعور پاتے ۔ ان کو زبان فطرۃ ملی تھی ، اکتساب اور جد و جہد سے نہیں ، ان کے ذوق کی ترقی کے لیے ایک فطری طریقہ اختیار کیا گیا ۔ اس کے لیے ان کے دلوں میں

شاعری کا رجحان پیدا کیا گیا ۔ تا کہ شعراء اپنے ہم زبانوں کو ''بلاواسطہ طریقِ تعلیم'' کے ذریعے بلاغت و فصاحت کے تصور سے روشناس کرائیں ۔ اور یہ کام جب پورا ہوا : عرب کا بچہ بچہ زبان کی خوبی کو بھانپنے لگا ۔ لیکن جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا ہے ان کا یہ ذوق محض اجمالی اور وجدانی تھا ۔ وہ اعلیٰ کلام سے لطف اندوز ہوتے تھے ، اس کی خوبی کو محسوس کرتے تھے ، اعلیٰ سے ادنیٰ کی تمیز بھی کر لیتے تھے ۔ مگر اس سب کے لیے وہ کوئی اصول یا قاعدہ نہیں بتا سکتے تھے ۔ ایک شیر کی مانند جو زندگی بھر شکار کرتا ہے ، مگر پوری زندگی ، بحیثیت فن ، شکار کے فن سے ناآشنا رہتا ہے ۔ حالانکہ جب شکار کا موقعہ آتا ہے تو وہ لا جواب مظاہرہ کرتا ہے ۔ فی الحقیقت فطرت کی راہ سے جتنی تربیت ملتی ہے ، وہ نہایت اجمالی ہوتی ہے ۔ اس سے کمالِ استعداد و صلاحیت تو پیدا ہو جاتی ہے ، لیکن کچھ اس انداز سے کہ اس کا شعور اور عملی مظاہرہ تو کیا جا سکتا ہے ، مگر بیان کی زبان اس کی شرح و بسط اور تفصیل سے قاصر ہوتی ہے ۔

اس کے برخلاف عجم نے عربی زبان اکتساب ، محنت اور جد و جہد سے حاصل کی تھی ۔ اس کے لیے محنت کرنا اور ان تفصیلات کو بیان کرنا ، جن سے گزر کر اس نے زبان سیکھی تھی ، آسان تھا ۔ لہٰذا اس کے لیے جو انتظام کیا گیا وہ اس کے حسبِ حال تھا ۔ فطرت نے اس کے ذہن کو یہ صلاحیت بخشی کہ وہ زبان کی ہر حالت کو تفصیل اور غور سے دیکھے ۔ اس کی جزوی تبدیلیوں کا مطالعہ کرے اس سے کلیات اور اصول اخذ کرے ۔ تا کہ وہ خود بھی کلام میں غلطی سے محفوظ رہے اور کلام میں خوبی کے عنصر کو بھی متعین کر سکے ۔ ہر چند اس کے لیے (بعض صحابہؓ کرام کے انداز سے ، جو عرب تھے) اس کی حوصلہ افزائی ہوئی اور دوسرے بہت سے گوشوں سے حوصلہ شکنی بھی ۔ تاہم اس نہج ہر کام کرکے غیر عرب مسلمانوں نے عربی زبان و ادب کے بیسیوں علوم وضع کر ڈالے ۔ آج یہ حقیقت عرب مصنفین کو ماننا پڑ رہی ہے کہ عربی زبان کا

اپنی اصلی حالت پر بقاء اور اس کی ترقی ، انھیں کوششوں کی مرہوںِ منت ہے ، جو غیرعرب مسلمانوں نے قرآن و سنت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سر انجام دیں ۔ علومِ بلاغت اور لسانی محاسن متعین کرنے کے لیے قواعد و ضوابط منضبط کرنے میں بھی انھیں مسلمانوں کی کاوش کو دخل ہے ۔ اس سلسلے میں بعض مصنفین کی جد و جہد کا اجمالی تعارف ضروری ہے ۔

اسی سلسلہ کا سب سے پہلا مردِ میدان ابوعبیدہ معمر بن مثنٰی باجروانی ہے ۔ ایک موقعہ پر وہ فضل بن ربیع کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے اس سے استفسار کیا کہ قرآن مجید کی آیت :

طلعها كانه رؤس الشياطين

میں درخت کے شگوفوں کی حقیقت سمجھانے کے لیے ۔ رؤس الشیاطن کی تشبیہ لائی گئی ہے ، جو غیر مرئی ہے ۔

حالانکہ تشبیہ کے لیے وجہ شبہ کا مشبہ بہ میں واضح طور پر موجود ہونا لازمی ہوتا ہے تا کہ مخاطب جس بات کو تشبیہ کے بغیر نہیں سمجھ سکا ۔ اسے تشبیہ کے ذریعے سمجھ سکے ۔ ابوعبیدہ نے جواب دیا کہ تشبیہ کے لیے بعض اوقات کسی غیر مرئی چیز کے متعلق مخالب کے اس اجمالی تصور سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے جو اس کو حاصل ہے ۔ مثال کے طور پر امرأ القیس کا شعر ہے :

"ايقتلنى و المشرفى مضاجعى
ومسنونة زرق الاسنة كانياب اغوال"

اس شعر میں نیزوں کو 'انیابِ اغوال' سے تشبیہ دی گئی ہے ، جو غیرمرئی ہے ۔ اور یہ شعر عرب میں بہت مقبول ہے ، کیونکہ انھوں نے اگرچہ 'انیاب اغوال' نہیں دیکھے تھے مگر ان کے متعلق ایک موہوم سا تصور رکھتے تھے ۔ حاضرین نے ابوعبیدہ کے اس طریقِ استدلال کو سراہا ۔ جس پر اس نے عزم کو لیا وہ قرآن مجید کی اس قسم کی آیات پر آپنے خیالات کا

اظہار کرے گا - جس کے بعد اس نے 'مجاز القرآن' کے نام ایک کتاب لکھی -

کتاب زیادہ تر لغوی تشریحات پر مشتمل ہے ، پھر بھی کئی ایسی مباحث آ گئی ہیں جو آج کل علم 'البیان' سے متعلق سمجھی جاتی ہیں - وہ آیات کی تشریح کے لیے جابجا عرب کے مسلمہ اشعار کو پیش کرتا ہے - اس نے مقدمہ میں تصریح کی ہے :

''و فی القرآن مثل ما فی کلام العرب من وجوہ الاعراب''

اس کے علاوہ ایک آیت کے مفہوم کی وضاحت دوسری آیت سے بھی کرتا ہے اور بعض اوقات استشہاد میں حدیث کو لاتا ہے -

فراء الدیلمی اپنے زمانہ میں فن ِ نحو کا امام مانا جاتا تھا - اگرچہ یہ بھی ان لوگوں میں سے تھا ، جو ابوعبیدہ پر تنقید کرتے تھے - پھر بھی اس نے خود ابوعبیدہ کے انداز پر 'معانی القرآن' کے نام سے کتاب لکھی - اس دور میں اسی نام سے کچھ اور کتابیں بھی منصہ ٔ شہود پر آ چکی تھیں - فراء نے اپنی کتاب میں نحوی مسائل کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے - قراءات پر بھی خاصی توجہ دی ہے - اس کی کتاب کی امتیازی صفت یہ ہے کہ مصنف کلام ِ الٰہی کے صوتی حسن کو خاص کر ملحوظ رکھتا ہے - مثال کے طور پر وہ آیت کریمہ :

ء اذا کنا عظاماً نخرہ

کے تحت دو قراءتیں درج کرتا ہے - ''نخرہ'' اور ''ناخرہ'' پھر مؤخرالذکر یعنی الف والی قراءت کو اس بنیاد پر راجح قرار دیتا ہے کہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی تمام آیات کے فواصل الف والے الفاظ ہیں - اس سے پہلی آیات کے فواصل راجفہ ، رادفہ ، خاشعہ ، حافرہ ہیں اور بعد کی آیات کے فواصل خاسرہ ، واحدہ اور ساہرہ ہیں - چونکہ ان فواصل میں ناخرہ یکسانیت اور حسن کا موجب ہے جو قرآن کی اکثر آیات میں موجود ہے

لہٰذا یہی راجح ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ معتزلہ کے اجتماعی اور انفرادی خیالات ، جن میں سے بیشتر عقیدۂ اسلام سے متعلق تھے ، یا سیاسی ریشہ دوانیوں کی شکل میں ، امت مسلمہ کے 'سوادِ اعظم' کے لیے ناگواری کا باعث بنے رہے تھے ۔ بایںہمہ دینی دفاع میں ، اور بالخصوص قرآنِ مجید کے بلاغی محاسن کو آشکارا کرنے میں ، جو خدمات انھوں نے سر انجام دیں ، وہ اس وقت تک صفحۂ تاریخ پر نقش رہیں گی ، جب تک 'اعجازِ قرآنی' اپنی تابانیوں سے قلوب عالم و عالمیاں کو گرماتا رہے گا ۔ ان کی اہم ترین شخصیتوں میں سے : واصل بن عطاء ، عمرو بن عبید ، نظام اور جاحظ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ نظام کا تصور 'وجوہِ اعجاز' کے سلسلے میں کافی گمراہ کن تھا ، جس کی تردید اس کے ہم مذہب جاحظ نے اپنی کتاب 'نظم القرآن' میں کی ۔ یہ کتاب آج کل میسر نہیں ۔ پھر بھی اسی مصنف کی 'البیان و التبیین' ، 'الحیوان' ، اور علامہ زمخشری کی تصریحات کی روشنی میں اس کتاب کے مباحث کے متعلق ایک واضح تصور قائم کیا جا سکتا ہے ۔ ان کے علاوہ شہرستانی اور بغدادی کے ہاں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے ۔

ابن قتیبہ دینوری ایک راسخ العقیدہ ''سواد الاعظمی'' تھا ۔ اس نے تیسری صدی کے وسط میں اپنی کتاب 'مشکل القرآن' لکھی ۔ جس میں اس نے بلاغی محاسن پر کلام کرتے ہوئے معتزلہ کی آراء کا خوب تعاقب کیا ۔ اس کے باوجود اس کی کتاب میں ابوعبیدہ ، فراء ، کسائی اور اخفش کا رنگ نمایاں ہے ۔ یہ کتاب بلاغی محاسن کے ان تمام تصورات کو جامع ہے جو اس کے دور تک عام ہو چکے تھے ۔ ابن قتیبہ کے ہاں بلاغی محاسن کے وجوہ اور اصول چھ ہیں :

یکم : 'نظم القرآن' یعنی اس کے الفاظ کا مناسب اور متناسب ہونا ۔ اور تراکیب کا سہل اور موجز ہونا ۔

دوم : صوتی حسن جو فواصلِ آیات ، نظم و نسق اور الفاظ و آیات کی

تعدیل و تسویہ سے پیدا ہوتا ہے ۔ وہ خود رقمطراز ہے :

وجعلہ متلواً لا یمل علی طول التلاوة ، و مسموعاً لاتمجہ الآذان و غضاً لایخلق علی کثرة الرد ۔

سوم : قرآنی فصاحت و بلاغت کا ، عرب کی روایتی فصاحت و بلاغت پر ، واضح برتری کا حامل ہونا ۔

چہارم : قرآن کا دیگر ، کتبِ ادیان پر شرعی و معنوی ، تفوق ۔

پنجم : مظاہرِ فطرت سے ہستیٔ باری تعالیٰ کی وحدانیت پر نہایت وقیع ، اور معنی خیز استدلال ۔

ششم : قاری اور سامع کے وجدان و شعور پر ایک غیر معمولی اثر ۔

عام علماءِ بلاغت کی طرح ابن قتیبہ بھی غیر عربی تھا ۔ ان چھ وجوہات کے ساتھ اس نے ایک ساتویں اہم وجہ کا بھی اضافہ کیا ۔ جو بعد میں عام ہو گئی ۔ مگر اس سے پہلے اس کی طرف کسی نے اشارہ نہیں کیا تھا اور سب سے پہلے اس کو ابن قتیبہ نے شدت سے محسوس کیا :

وہ یہ ہے کہ کسی دوسری زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والا اس کے مفہوم کو جزوی طور پر تو بیان کر سکتا ہے ۔ مگر کلام و معنی کے محاسن کو اپنے ترجمہ میں سمو دینے سے عاجز اور قاصر ہے ۔ وہ خود رقمطراز ہے :

و بکل ھذا المذاہب نزل القرآن و لذلک لایقدر احد من التراجم ان ینقلہ ، الی شئی من الالسنة . . . الاتریٰ انک لواردت ان تنقل قولہ ”و اما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیھم علی سواء“ لم تستطع ان تاتی بھٰذا الالفاظ مؤدیة عن المعنی الذی اود عتة الآیة حتی تبسط مجموعھا و تصل مقطوعھا و تظھر مستورھا ۔

ابو زید قرشی کی جمہرہ اگرچہ اشعار کا ایک مجموعہ ہے پھر بھی اس کے مقدمہ سے عیاں ہے کہ اس کے مصنف کو قرآن مجید کے بلاغی

محاسن کا اعتناء مقصود ہے - یہی بات عسکری ، شریف برادران اور القیروانی کے ہاں ہے - ابن المعتز بھی کافی واضح ہو گیا ہے - قدامہ بن جعفر نے ایک حد تک گم سم رہ کر بلاوجہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا ، کہ اس کا 'شجرہ' ارسطو کی خطابت و شعر سے ملاتے پھریں - اس میں قصور نرا کا قدامہ ہی نہیں تھا ، یار لوگوں پر بھی یونانیت (Hellenism) کا کچھ ایسا خبط سوار ہوا ہے کہ انہیں گاہ بےگاہ بےکلی سی ہونے لگتی ہے - رمانی کی 'النکت فی اعجاز القرآن' تو بالکل واضح تھی - انہیں اس کی تقسیم میں بھی ارسطو کا شائبہ ہونے لگا -

اس سلسلے میں ابن الاثیر کی 'المثل السائر' ، خفاجی کی 'سر الفصاحۃ' العلوی 'الطراز' اور امام عبدالقاہر جرجانی کی 'دلائل الاعجاز' نہایت جامع اور نادر کام ہیں - امام عبدالقاہر پر تو کافی حواشی اور مختصرات معرض وجود میں آئیں - جن میں سکاکی ، قزوینی ، تفتازانی اور سبکی مشہور ہیں -

یہ تھے عظماء جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم کتاب کی عظمتیں آشکارا کرنے کے لیے چن لیا ، پھر اس نے ان کو ایسا بقاء و دوام بخشا کہ زمانہ ان کے پاس سے کنی کترا کر کچھ اس طرح نکل جاتا ہے جیسے :

اذا طلعت تزاور عن کہفہم ذات الیمین و اذا غربت تقرضہم ذات الشمال و ہم فی فجوۃ منہ . ذلک من آیات اللہ .

یہ کام اس کے بعد بھی جاری رہا - اور آج بھی اللہ کے فضل سے جاری ہے ، اور ہمیشہ جاری رہے گا -

اس موقعے پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سامعین کو قرآنی عظمت بیان کی چند جھلکیوں سے بہرہ افروز کیا جائے - یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ کسی فن کی ابتداء وجدان سے ہوتی ہے - اور جب تک وہ وجدان کے دائرہ میں رہتا ہے اس میں فطرت کا حسن ، رونق ، دلکشی اور جاذبیت

کامل و اکمل ہوتی ہے ۔ جوں وہ عقل و منطق کی حدود میں داخل ہوتا ہے ۔ فنی اصطلاحات کے سائے اس پر محیط ہونا شروع ہو جاتے ہیں جو دم بدم گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ اور پھر جس قدر وہ فن آگے بڑھتا ہے اس کی دقیقوں ، باریکیوں اور گہرائیوں تک رسائی پا سکنے والوں کا دائرہ محدود سے محدود تر ہوتا جاتا ہے ۔ صورتحال یہاں بھی یہی ہوتی ۔ لیکن اس ناچیز نے موقعے کے مطابق زیرِ نظر آیات کے صرف ان پہلوؤں پر اکتفا کیا ہے جو انسانی وجدان کی براہ راست رسائی میں ہیں ۔ اور انھیں سمجھنے کے لیے کسی فنی پیچیدگی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا ۔

سب سے پہلے سورۂ فاتحہ پر کچھ عرض کرتا ہوں ۔ کیونکہ اس سے قرآن کی ابتداء ہوتی ہے ۔ یہ سورت نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے ۔ اس کو قرآن کا لبِ لباب بھی بتایا گیا ہے ۔ اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر بہت سے بزرگوں نے اس پر ضخیم تصانیف بھی چھوڑی ہیں ۔

اس سورہ کی ابتداء لفظِ 'حمد' سے ہوتی ہے ۔ حمد کا لفظ نہایت عام فہم ہو گیا ہے ۔ ذرا غور کیجیے مذہبی بدعات اور لا مذہبیت نے خدا اور مذہب کے تصور کو خرافات اور قباحتوں سے کس قدر میلا اور گدلا کر دیا تھا ۔ لفظِ 'حمد' لا کر نہ صرف ان سب کو دھو ڈالا گیا ۔ اور زائل کر دیا گیا ، بلکہ مذہب کو حسن و جمال کے لافانی تصور سے بھی آراستہ کر دیا گیا ، پھر اس حسن و جمال کا مرکز اور منبع اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کو بتایا گیا ہے ۔ 'رب العالمین' فرما کر تمام کائنات اور عوالم کو مظہرِ حسن و جمال بنا دیا گیا ہے ۔ کیونکہ ان کو ہر دم زیست اور بقاءِ زیست وہاں سے نصیب ہوتی ہے جو 'رحمٰن' بھی ہے اور 'رحیم' بھی ۔ اس حسن و جمال کی کیفیات کا کیا ٹھکانا جن کا اوڑھنا بچھونا رحم ہی رحم ہو ۔ 'مالکِ یومِ الدین' لا کر اس نے جزاء ، سزا اور ان قوتوں سے مواخذ کا تصور بھی دیا ہے جو اس کائنات میں رہ کر اپنی بے اعتدالیوں سے اس کے حسن و جمال کو خراب کرنے کے درپے ہیں ۔ گو یہ قوتیں لاکھ

کہیں کہ :

لا قعدن لہم صراطک المستقیم

وہ فرماتا ہے :

'ان عبادی لیس لک علیہم سلطان'

(یعنی) جو میرا ہو گیا اس پر ان قوتوں کا کچھ فسوں نہیں چل سکتا ۔

'مالکِ یومِ الدین' کے بعد معاً وہ اپنے بندوں کی زبانی کہلواتا ہے ۔ کچھ اس پر کیف انداز سے جیسے حسن و جمال کا 'مظہر اتم' پوری کائنات کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے خالق و مالک سے گویا ہو : وہ اسی کے ہیں ، اسی لیے اس سے اعانت کے طلب گار ہیں ۔ اور اس کے ان بندوں کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں جو 'صراطِ مستقیم' پر اس طرح جادہ پیما رہے کہ ان سے نہ کبھی ایسی غلطی ہوئی جس کے سبب وہ راہ راست سے بھٹک گئے ہوتے ، اور نہ ہی ان سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ وہ 'سرچشمۂ حسن و جمال' کے موردِ عتاب ٹھہرتے ۔

اس طرح اس مختصر سی سورت میں :

مذہب کا تصور ، عقیدۂ خدا ، کائنات کا تصور ،
خدا اور کائنات کا رشتہ ۔ طاغوتی طاقتوں کا انجام ،

اس کے ہو کر رہنے والوں کے لیے زندگی کا مکمل لائحۂ عمل واضح کر دیا گیا ہے ۔ مگر ان سب باتوں میں ایک تصور مشترک ہے ، اور ہر ایک میں جاری و ساری ہے ۔ وہ ہے حمد کا تصور اور حسن و جمال کا تصور ۔

ان چند جملوں میں میں نے نہ تو ترجمہ کیا ہے اور نہ تفسیر اور نہ ہی اس قلیل وقت میں اس کا حق ادا ہو سکتا ہے ۔ میرا مقصد تو ان کلمات سے آپ کے وجدان تک رسائی حاصل کرنا تھی تا کہ ہم سب پر اس کی لافانی کتاب کے محاسن و معانی کی راہیں کھلیں ۔

قربانی کا موقعہ ہے ۔ ذرا اس مناسبت سے بھی ایک آیت سے تنویر حاصل کر لی جائے۔ لیکن آیت کا مطلوبہ حصہ تلاوت کرنے کے پہلے میں آپ کی توجہ ایک اہم سوال کی طرف مبذول کراتا ہوں ۔ وہ یہ ہے کہ :

ایک باپ جس کو سالہا سال کی التجاء اور گریہ و زاری کے بعد پیرانہ سالی میں اکلوتا بیٹا ملا تھا ۔ جس کے بعد اس کو اطمینان نصیب ہوا کہ جس 'عظیم مقصد' کے لیے اس نے پوری زندگی صرف کی ہے ، وہ آئندہ بھی چلتا رہے گا ۔ کیونکہ اس کی زندگی کا آثاثہ تو اس کے بغیر کچھ نہ تھا ۔ مگر اچانک میاں کی طرف اسے شارہ ملا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دے ۔ وہ دل و جان سے اس کام کو سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گیا ۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے : باپ اپنے لخت جگر سے یہ بات کس طرح کہے ؟ کیا انداز ہو اور کیا طریق کار ؟ جب کہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ بیٹا اس کے لیے بخوشی اور بہ طیب خاطر تیار ہو جائے ۔ ایک بار پھر سوچیے : ایک حساس ، رحم اور ترحم کا پیکر ، بوڑھا باپ اپنے اکلوتے سے اس قدر بڑی بات کیسے کہے ؟ جب آپ سوچیں گے تو آپ کا ذہن اس بات کے کہنے سے پہلے بہت سے مقدمات ، تمہیدات اور وعظ و نصیحت کرنے کی تلقین کرے گا ۔ وہ آپ کو حزم و احتیاط کا مشورہ دے گا ۔ تا کہ نتائج حسب منشا ہوں ۔ اب آپ حضرت ابراہیم کی طرف آئیے ۔ اور سر دھنیے ، کہ وہ اپنے لخت جگر سے یہ بات بغیر کسی تمہید اور وعظ و تلقین کے سادہ انداز میں کہہ دیتے ہیں ، فرمایا :

یا بنی ، انی اریٰ فی المنام انی اذبحک ، فانظر ما ذا تریٰ ۔

پیارے بیٹے ! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تم کو ذبح کرتا ہوں ، بتا تیری کیا رائے ہے ؟

آیت کا پہلا حصہ یا بنی ہے جس سے بتانا مقصود ہے کہ پدری شفقت

جوش میں ہے - یہ باپ کی نفسیاتی کیفیت ہے - دوسرے حصہ میں خواب کا ذکر ہے - جس میں اصل مدعا کی طرف خفیف سا اشارہ ہے - اور آخری جملہ میں اپنی منشاء کا اظہار نہایت عجیب انداز میں کیا گیا ہے - اس میں نہ تو کہیں حکمِ خدا وندی کا ذکر کیا گیا ہے - اور نہ وعظ و نصیحت اور تلقین ہے - اور نہ ہی قائل کرنے کی کوشش کی گئی ہے - بلکہ اپنی منشاء کے اظہار میں بھی نہایت خفیف اور غیر زور دار الفاظ سے کام لیا گیا ہے -

ان سب باتوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا ؟ کہ باپ کو اپنے بیٹے کی سعادت مندی پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ بڑی سے بڑی بات کے لیے مختصر اشارہ اور ایماء سے اپنی منشاء کا اظہار کر دینا کافی سمجھتا تھا - نتائجُ حسبِ منشاء بلکہ اس سے بڑھ کر حوصلہ افزاء برآمد ہوئے - اس کے لیے اسماعیل علیہ اسلام کا جواب پڑھیے - فرمایا :

یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاءاللہ من الصابرین

جواب کے بھی تین حصے ہیں ، پہلے حصے سے اس بات کو دل نشین کرانا مقصود ہے کہ بیٹے کے دل میں بھی باپ کی قدر و منزلت اور عزت و احترام کا جذبہ موجزن ہے - بالخصوص اس وقت بھی جب اس قدر بڑی بات کہہ دی گئی ہے - دوسرے جملہ میں اس بات کا تاثر دیا گیا ہے کہ بیٹا باپ کے مقام کا شناسا تھا اور بے حد اطاعت شعار بھی - تیسرے جملہ میں اس بات کا اطمینان کہ وہ اس تمام عمل میں بے حد صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے گا -

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس قدر اطاعت شعاری تو حضرت اسماعیل نے اس لیے دکھائی کہ ان کا والد ماجد نبوت کے عظیم مرتبہ پر فائز تھا - ورنہ ایک باپ کی حیثیت سے اتنی بڑی بات کہی ہوتی تو وہ اس قدر جلد تھوڑا تیار ہو جاتا - مگر ، یہ شبہ صحیح نہ ہوگا - کیونکہ ،

یوں تو انبیاء علیہم السلام کی کسی بات اور ان کے کسی فعل سے نبوت کو جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ تاہم یہاں صرف پدری رشتہ ہی مطمح نظر تھا ۔ ورنہ کسی اور شخص کو ذبح کرنے کا حکم دے دیا گیا ہوتا تو بھی ، جہاں تک انسانی گلے پر چھری چلانے کا سوال ہے ، ابراہیم علیہ السلام جیسے نرم دل اور حساس انسان کے لیے بیٹے اور غیر کے درمیان چنداں فرق نہ ہوتا ۔ پھر یہاں جو پس منظر مقصود ہے وہ بیٹے کی نہایت درجہ سعادت مندی ہے ۔ سعادت مند تو سعادت مند ہوتا ہے خواہ کسی مرتبہ کا باپ ہو ۔ اور بدبخت بدبخت ، خواہ اس کا واسطہ نبی سے ہی کیوں نہ ہو ۔

وہاں بھی تو باپ نبی تھا ۔ جب بیٹے مصر کے ایک عظیم انسان یا بادشاہ سے مل کر آئے تھے اور باپ سے ماجرا کہہ سنا رہے تھے ، تو باپ نے چاہا ان کی غلطی کا ازالہ کر دے کہ جس شخص سے وہ مل کر آئے ہیں ، وہ وہ نہیں جو وہ سمجھے ہیں ، بلکہ وہ وہ ہے جو باپ سمجھے ہیں ۔ حضرت یعقوب کا خیال تھا کہ یہ یوسف ہے ۔ صورتِ حال کی مزید تحقیق کے لیے بھیجا گیا ۔ پھر عین اس وقت جب مصر سے یوسف علیہ السلام کا قمیص لے کر روانہ ہو رہے تھے ، تا کہ باپ کو خوشخبری سنائیں ۔ تو یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے چاہا کہ بیٹوں کو یقین دلائیں کہ وہ یوسف ہی ہے ۔ مگر اس کے لیے انھوں نے جو انداز اختیار کیا وہ ہماری اس بحث سے متعلق ہے ، فرمایا :

انی لاجد ریح یوسف ، لولا ان تفندون ۔

مفہوم یہ ہے : ڈر ہے کہ تم کہو گے بوڑھا سٹھیا گیا ورنہ مجھے تو یوسف کا یقین ہی ہو گیا ہے ۔ کیا یہاں ابیٹےس بات سے بے خبر تھے کہ باپ نبوت کے عہدے پر فائز ہے ۔ پھر باپ ان سے معمولی سی بات کہتے ہوئے اس قدر خائف کیوں ہے ؟ کیا اس لیے نہیں کہ وہ بیٹوں کو سمجھتا ہے کہ ذرا ان کی منشاء کے خلاف بات کیجیے پھر وہ باپ بیٹے کے تعلقات کی تمام نزاکتوں کو یکسر نظر انداز کر کے وہ سب کچھ اگل

دیتے ہیں جو گندگی ان کے گندے ذہن میں ہوتی ہے ۔ اور ہوا بھی یونھی ۔ یعقوب علیہ السلام کی بات سنتے ہی انھوں بغیر کسی لگی لپٹی کے ٹکا دی :

انک لفی ضلالک القدیم

کہ : آپ پر تو وہی پرانا ایک ہی خبط سوار ہے ۔"

یہاں 'انک' اور فی 'ضلالک' کی دوہری نسبت یعقوبؑ کی طرف پھر ان ، لام تاکید اور جملہ اسمیہ سے تاکید اور بات میں شدت پیدا کرنے والے عوامل پھر اس پر لفظِ 'قدیم' کا سہاگا ، کہا یہ سب اس لیے نہیں کہ اس بات کو عیاں کریں : بیٹے باپ سے بے حد نالاں اور خفا تھے ۔ ورنہ اس قدر معمولی سی بات پر اس طرح تاکیدی اور سخت جواب بے سبب تو نہیں ۔ پیر رومی نے کیا خوب فرمایا :

شمشیرِ نیک ز آہن بد چو کند کسے
ناکس بتربیت نشود اے حکیم کس

حضرتِ نوح علیہ السلام بھی تو نبی تھے ۔ پھر ابراہیمؑ تو ذبح کرنا چاہ رہے تھے اور یہاں باپ بیٹے کو موت کے منہ سے نکالنے لگا تھا ۔ یہ بات پہلے کے مقابلہ نہایت ہی خوش گوار اور مرغوب تھی ۔ باپ نے فرمایا :

یا بنی ارکب معنا و لاتکن مع الکافرین

بیٹا ! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ ۔ اور ان کافروں کے ساتھ مت شامل ہو ۔

کس قدر پیار ہے بات میں ! ارشاد واضح اور براہ راست ہے ۔ اس میں انجامِ بد سے بھی ڈرا دیا گیا ہے ۔ سامنے باپ ہے اور نبی بھی ۔ پھر آثار بھی کچھ ایسے ہیں جو ایک حساس انسان کو دعوتِ فکر دیتے ہیں ۔ مگر اس کی بدبختی اسے کچھ بھی سمجھنے کی فرصت نہیں دیتی ۔ اور وہ چھٹتے

ہی کچھ اس انداز سے جواب دیتا ہے جیسے باپ کی کسی کمزوری کا مذاق اڑانے چلا ہو :

ساوی الی جبل یعصمنی من الماء

مفہوم ہے : ارے میں ایک منٹ میں پہاڑ تک پہنچا چاہتا ہوں ، پانی میرا کیا بگاڑ لے گا ۔

باپ نے غلطی کا ازالہ کرنا چاہا کہ :

لا عاصم الیوم من امر اللہ الامن رحم

مفہوم : کہ تم غلطی پر ہو ، یہ پانی تو نہیں ۔ یہ تو ''اللہ کا حکم ہے'' جس سے خدا کے سوا کوئی چیز نہ بچا سکے گی ۔

اس پر موجوں نے بڑھ کر بیٹے کو مزید کسی قسم کی دریدہ دہنی کرنے سے روک دیا ۔

ان تینوں قسم کی آیات کو ایک جگہ جمع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تینوں کے الفاظ اور تراکیب ، اور بعض الفاظ کے اضافہ اور کمی کو ملاحظہ کیا جائے ۔ اور غور سے دیکھا جائے کہ وہ نہایت مختصر ہونے کے باوجود نہ صرف نفس واقعہ کی عکاس ہیں ۔ بلکہ ایک عجیب انداز سے تمام پس منظر کو اس طرح بیان کر دیتی ہیں جس پر ہزار بیان قربان جائیں ۔ کچھ ایسے زاویہ سے کہ جو دور دور تک سلسلۂ واقعات کی تصویر پیش کر دے ۔

آخر میں ایک اور اعجازی کیفیت کی طرف آپ کی توجہ مطلوب ہے : یہ وہ بات ہے جس طرف سے امام عبدالقاہر جرجانی نے 'دلائل الاعجاز' میں اشارہ کیا ہے ۔ وہ ہے قرآن کا انداز تخاطب ، کہ وہ جس طرح اپنے خاص وفادار اور وفا شعاروں کو خطاب کرتا ہے ۔ ٹھیک اسی انداز میں جو یقین و اعتماد اور اظہارِ قدرتِ کاملہ کی ہزار کیفیتیں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتا ہے ، وہ بےجان اور جامد چیزوں سے خطاب کرتا ہے ۔

ملاحظہ ہو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کو حکم دیتا ہے :

یا داؤد انا جعلناک خلیفة فی الارض

داؤد ! ہم نے تمھیں زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے -

دوسری طرف وہ پہاڑوں حکم دیتا ہے :

یا جبال اوبی معہ و الطیر

پہاڑو ! نرم اور گداز آواز کے ساتھ پڑھو داؤد کے ساتھ ، اور پرندے بھی -

یہاں 'جبال' اور 'الطیر' کے الفاظ کو، جو بیک وقت حرف ندا سے متعلق ہیں ، جدا کر کے ''اوبی معہ'' کا براہ راست تعلق پہاڑوں کے ساتھ کر دیا گیا ہے - پرندوں میں کچھ خوش گلو بھی ہوتے ہیں - مگر پہاڑ کہاں اور نرمی و گداز کہاں - کیا یہ اس لیے نہیں کہ اس کا حکم جب آتا ہے تو کمالِ استعداد اپنے ساتھ لاتا ہے -

ایک اور اسی قسم آیت سے تنویر حاصل کیجیے :

لوگوں نے آگ جلائی تھی تا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس میں جھونک دیں - اس نے حکم دے دیا آگ اپنا کام کرنا چھوڑ کر وہ کرے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے - فرمایا :
یا نار ! کونی برداً و سلاما ، علی ابراہیم -

تیسری آیت دیکھیے - فطرت کی قوتیں شدید طغیانی اور ہیجان میں تھیں - بلکہ یوں کہیے وہ قابو سے باہر ہوئی تھیں تاکہ صفحۂ ہستی پر ہر چیز کو پامال کر دیں - جب وہ کام کر چکیں ، جس کا انھیں پابند کیا گیا تھا ، تو فطرتی طاقت کے دو عظیم سرچشموں : آسمان اور زمین حکم ہوا :

یا ارض ابلعی ماءک و یا سماء اقلعی

- زمین ! اپنا پانی نگل جا - آسمان ! اپنا پانی جڑ سے بھی واپس کر لے -

اور دیکھتے ہی دیکھتے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا ۔

دیکھا آپ نے اس کی کے بے پناہ قوت کا اظہار ۔ یہ ایک دو آیات بطورِ نمونہ پیش کی ہیں ورنہ اس کی عظمتوں کا کیا ٹھکانہ ۔

وہ عظمتوں کا آفتابِ جہاں تاب ہے ۔ اس کے سامنے ایک ناچیز ذرہ کی اس کے سوا کیا مجال کہ اس کی تابانیوں میں اپنے وجود کا احساس کرے اور پھر اس کی لامتناہیوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائے ۔

دامانِ نگہ تنگ گلِ حسن تو بسیار
گل چینِ بہارِ توز داماں گلہ دارد

۱۴ دسمبر ۱۹۲۳ء علی الصباح

☆ ☆ ☆